# فقہِ حنفی۔ خصائص و امتیازات

ڈاکٹر محمد میاں صدیقی ☆

امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابتؒ تاریخ فقہ اسلامی کی ایک ایسی مرکزی شخصیت ہیں جن کے آگے بہت سے ایسے اہلِ علم وفضل نے زانوائے ادب تہہ کیا جو خود درجۂ اجتہاد پر فائز تھے۔ یا ہوئے۔ اور جو حضرات براہ راست ان سے اکتساب علوم سے محروم رہے انہوں نے ان کے نامور تلامذہ سے رجوع کیا۔

اسی حقیقت اور صورتِ حال نے امام مجتہد محمد بن ادریس شافعیؒ کی زبان سے کہلوایا کہ: ''فقہ میں سبھی لوگ ابو حنیفہؒ کی اولاد ہیں''۔ (۱)

''فقہِ حنفی'' اسی امام کے اجتہادات، ان کے تربیت یافتہ تلامذہ کی آراء اور مختلف علوم کے ماہرین کی تحقیق، بحث ونظر اور منفرد طرزِ استدلال پر مبنی تخریج وتفریع کا نام ہے۔

فقہِ حنفی کی خصوصیات و اولیات پر گفتگو کرنے، اور اس کے عمومی مزاج کو سمجھنے سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ جس امام اور مجتہد کی فقہ، جس شہر اور جس علاقہ میں پروان چڑھی، اس نے ارتقائی مراحل طے کیے، اس پر وہاں کے علمی ماحول کا کس حد تک اثر تھا۔ مثلاً فقہ مالکی نے مدینہ میں ارتقائی مراحل طے کیے، اس پر علمائے مدینہ کے تعامل اور فقہی آراء نے اثر ڈالا۔ جن صحابہ کے حلقہ درس سے مدینہ آباد تھا، فقہ مالکی کی عمارت انہی کے فتاویٰ اور اجتہادات پر تعمیر ہوئی۔

---

☆ مدیر مجلّہ ''معارفِ اسلامی''۔ ومشیر تحقیق کلیہ عربی و علوم اسلامیہ۔
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔

مکہ میں عبد اللہ بن عباسؓ کے علم و تفقہ کی روشنی تھی، امام شافعیؒ کے دور میں مکہ کے اکثر فقہاء اور محدثین انہی کے علم کے امین تھے۔ امام شافعیؒ نے اپنے علمی اور فقہی سفر کا آغاز مکہ سے کیا۔ اس لیے ان کی فقہ وہاں کا اثر قبول کیے بغیر نہ رہ سکی۔

فقہِ حنفی کی ابتداء کوفہ سے ہوئی۔ یہیں اس نے ارتقائی منزلیں طے کیں، مکہ اور مدینہ۔ ان دونوں شہروں کو یہ فخر و امتیاز حاصل ہے کہ اللہ کے آخری رسول کی نبوت و رسالت کا سورج یہیں سے طلوع ہوا، علومِ نبوت کی پہلی کرن یہیں سے پھوٹی۔ کوفہ، اگرچہ نیا شہر تھا، خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت میں اس کی بنیاد پڑی۔ لیکن عمر فاروقؓ نے، عبد اللہ بن مسعودؓ جیسے فقیہ اور نکتہ رس صحابی کو وہاں کی آبادی کے علمی سنگھار کے لیے بھیجا۔ اور بھی اہل علم و فضل اس شہر میں منتقل ہوئے۔

حدیث اور فقہ کی درس گاہیں قائم ہوئیں۔ مزاجِ نبوت کے شناسا اور فقہ الرائے کے اولین مؤسس عمر فاروقؓ نے جب عبد اللہ بن مسعودؓ کو کوفہ بھیجا تو وہاں کے لوگوں کو لکھا کہ: ''میں ابن مسعود کو بھیج کر ایثار سے کام لے رہا ہوں''۔ (۳)

خلیفۂ سوم حضرت عثمان بن عفانؓ کی شہادت کے بعد جب عالمِ اسلام کا سیاسی مرکز، مدینہ سے منتقل ہو کر کوفہ بنا تو لازمی طور پر علمی، فکری اور تمدنی دار الخلافہ کی حیثیت بھی کوفہ نے اختیار کر لی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے قدموں نے کوفہ کو اکسیر بنا دیا، عمرؓ اور علیؓ کی برکت سے یہ شہر ایک ہزار سے زیادہ صحابہ کا مسکن بنا، وہ خاکِ حجاز سے اٹھے اور عراق کی سرسبز و شاداب زمینوں پر آکر انہوں نے اپنا رختِ سفر کھولا۔ اور پھر یہیں طرحِ اقامت ڈال دی۔

شبلی نعمانی کا کہنا ہے کہ: مکہ اور مدینہ سے کوفہ منتقل ہونے والے صحابہ میں چوبیس بدری صحابہؓ بھی تھے۔ (۴)

## کوفہ کی منفرد حیثیت:

کوفہ کے بارے میں یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ دوسرے شہروں کے بالمقابل عراق اور بالخصوص کوفہ کو ایک خاص امتیاز حاصل تھا، عراق ایسا علاقہ تھا جہاں عربی و

عجمی تہذیب باہم گلے ملتی تھی، جہاں عرب کے سادہ اور ایران کے پر تکلف معاشرے کا امتزاج تھا، یہاں کے فقہاء نہ صرف ایک نئے عقیدے سے بلکہ ایک نئی تہذیب سے آشنا ہو رہے تھے، انہیں کثرت سے ایسے مسائل کا سامنا تھا جن کے حل کے لیے قیاس اور رائے کے سوا چارہ نہ تھا، انہیں بار بار اس امر کا احساس ہوتا تھا کہ نصوص "جزئیات" کے احاطے سے قاصر ہیں، اور واقعات و حوادث کا ایک تسلسل ہے جس کے ختم ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ فقہائے حجاز جو سیدھے سادے عربی معاشرے میں اجتہاد و افتاء کا فرض انجام دے رہے تھے، وہ اس صورتِ حال سے دو چار نہ تھے۔

دوسرا فرق یہ تھا کہ علمی مسائل میں بھی عربوں کا مزاج سادہ اور تکلفات سے خالی تھا، یہ وہی مزاج تھا جس کو پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے الفاظ میں یوں بیان فرمایا تھا: نحن امة امّيّةٌ لا نكتب ولا نحسب. الشهر هكذا وهكذا". یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں فقہائے حجاز کے یہاں بحث و نظر اور قیل قال کم ہے۔ استنباطِ احکام میں وہ زیادہ تر نصوص کے ظاہری مفہوم پر اکتفاء کرتے ہیں۔ اس کے بر خلاف مشرقی علاقہ، جو مختلف ادوار میں مختلف تحریکات اور افکار و نظریات کی آماج گاہ تھا، ذہانت، دقتِ نظر، اور تحقیق و تشقیق اس کے مزاج کا حصہ تھی۔ عراقی فقہاء کے لیے اس روش سے ہٹنا ممکن نہ تھا۔ عراقی فقہاء کے یہاں ممکن الوقوع مسائل پر بحث و تمحیص، نصوص کے ظاہری مفہوم کے ساتھ اس کی تہہ میں غواصی، احکام کی مختلف شقوں کا استخراج، ان کے اسباب و علل اور حکمت پر نظر، اور اس کے تحت نصوص کی تخصیص، مجمل کی تعیین، اور الفاظ کی منطقی تحدید زیادہ پائی جاتی تھی۔(د)

تیسرا فرق یہ تھا کہ اس علاقے کی ذکاوت اور نکتہ رسی نے بطور خاص کوفہ کو اسلامی علوم کا گلستانِ سدا بہار بنا دیا تھا۔ اس امر میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ دوسری صدی ہجری میں فقہ و اجتہاد کا سب سے بڑا مرکز کوفہ تھا۔ فقہ کے علاوہ، حدیث و تفسیر اور مختلف علوم کی امامت اسی خطہ کو حاصل ہو گئی تھی، کوفہ سیاسی معرکہ آرائی کے ساتھ کلامی بحثوں کا دنگل بھی بنا ہوا تھا۔ اس صورتِ حال نے علماء کو اس طرف متوجہ کیا کہ وہ احادیث کے اخذ و قبول میں احتیاط سے کام لیں، اور احکام کے استنباط و استخراج پر پوری توجہ مرکوز کریں

تاکہ دین کا مجموعی مزاج منقح ہو، اور مسائل کے شرعی احکام بے غبار طریقے سے لوگوں کے سامنے آجائیں۔

## خصائص و امتیازات :

فقہ حنفی کے بارے میں چند ابتدائی وضاحتوں کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی عمومی خصوصیات کو بیان کیا جائے۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جو فقہ حنفی کو دوسرے فقہی مکاتبِ فکر سے ممتاز کرتی ہیں۔

۱: فقہ حنفی کا اولین امتیاز یہ ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے دورِ خلافت میں اجتماعی اجتہاد کی جو طرح ڈالی تھی، اس فقہ کے بانی ابو حنیفہؒ انہی کے نقوشِ پا پر چلے، عمر فاروقؓ کے طریقِ کار۔ بلکہ یوں کہیئے کہ ان کی سنت کی تجدید کی، عمر فاروقؓ، امیر المؤمنین ہونے کے باوجود تنہا فیصلے نہیں کرتے تھے۔ مدینہ کے فقہاء صحابہ کو بلاتے، زیر بحث مسئلہ ان کے سامنے رکھتے، سب کو بحث و نظر کی دعوت دیتے۔ معاملے کے تمام پہلوؤں پر جب خوب بحث و تمحیص ہو جاتی پھر کسی نتیجے پر پہنچتے، عمر فاروقؓ اپنی رائے اور دلائل آخر میں پیش کرتے اور شاملِ بحث افراد کو اس کا قائل کرتے۔ پھر کوئی اجتماعی فیصلہ ہوتا۔ عمر فاروقؓ کے بعد فقہائے مدینہ نے اجتماعی غور و فکر میں تسلسل کو جاری رکھا، دوسری صدی ہجری کے اوائل میں جب ابو حنیفہؒ نے اپنے استاذ حماد کی مسندِ درس اور مسندِ فقہ کو رونق بخشی تو انہوں نے ذاتی اور انفرادی اجتہاد پر سنتِ عمرؓ کی پیروی کرتے ہوئے اجتماعی اجتہاد کو ترجیح دی۔ اس پر خطر وادی میں پھونک پھونک کر قدم رکھے، اور سنبھل سنبھل کر اس خارزار سے گزرنے کی کوشش کی۔

امام ابو حنیفہؒ کی علمی زندگی میں جو چیز سب سے عظیم اور قابلِ قدر ہے، وہ اصول استنباط کا انضباط ہے، اس کے سبب بعد میں آنے والوں کے لیے اجتہاد کی راہ ہموار ہوئی، ورنہ اس سے پہلے فقہ، جزئیاتِ مسائل کا نام تھا۔ ابو حنیفہؒ کی علمی کاوشوں نے اسے فن کی حیثیت عطا کی۔

## ۲۔اصول اجتہاد :

امام ابو حنیفہؒ نے اجتہاد کے لیے جو اصول وضع کیے، اور ان کی روشنی میں کتاب اللہ اور سنت رسول سے احکام اخذ کیے، وہ باقی ائمہ کے وضع کردہ اصول و ضوابط سے کہیں زیادہ وسعت اور جامعیت کے حامل ہیں۔ ایک مسلمان خواہ کسی حیثیت میں ہو، اور اسے کوئی بھی ضرورت در پیش ہو وہ حنفی اصول کی روشنی میں بھرپور رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔ ابو حنیفہؒ نے اصولی اور بنیادی فرق یہ کیا، اور یہیں سے اپنے فقہ کی وسیع اور بلند و بالا عمارت کو اٹھایا، کہ دوسرے ائمہ نے صرف احکام فرعیہ شرعیہ ہی کو اصول فقہ کی تعریف میں شامل کیا جب کہ امام ابو حنیفہؒ نے "معرفة النفس مالها وماعليها" پر اپنے اصولِ فقہ کی بنیاد رکھی۔ اس سے یہ فرق پڑا کہ دوسرے ائمہ کے اصول، انسان کے ظاہری اعمال اور ان سے متعلق احکام پر محیط ہیں، اور امام ابو حنیفہؒ کے اصول نے انسان کے اعتقادی عمل حتیٰ کہ نفسیاتی اعمال و افعال کا بھی احاطہ کر لیا ہے۔

دوسرے ائمہ کے اصول کا تعلق عام طور پر عبادات، معاملات، اور مناکحات (معاشرتی مسائل۔ نکاح و طلاق وغیرہ) سے ہے، امام ابو حنیفہؒ کے اصول کا دائرہ اس حد تک وسیع ہے کہ بین الاقوامی امور بھی ان کے احاطہ سے باہر نہیں ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ جب بھی اسلامی قوانین کو حکومتی سطح پر اپنایا گیا، اور حکومتی آئین کے طور پر اسے نافذ کیا گیا تو فقہ حنفی ہی کو بنیاد بنایا گیا۔

اس کے علاوہ عام انسانوں کی ضرورت، رسم و رواج، اور بطور خاص اجتماعی مسائل اور حاجات کو فقہ حنفی میں اس حد تک اہمیت دی گئی ہے کہ عرف، اور لوگوں کے تعامل (رسم و رواج) کو بھی احکام کی بنیاد قرار دیا گیا، اور امکانی حد تک مسلمان کے قول و عمل کو قانونی تحفظ دیا گیا ہے۔ حلال و حرام کی حدوں کو چھوئے بغیر فرد اور معاشرہ کی سہولت اور مفاد کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ شافعی مسلک کے جلیل القدر علماء تک یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ :امت مسلمہ کو اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انہوں نے ابو حنیفہؒ کے ذریعے مسلمانوں کے لیے عمل بالقرآن والسنہ میں وسیع گنجائش پیدا کر دی ہے۔(۶)

امام ابو حنیفہؒ نے اپنے اجتہادی اصول میں عوام کے عرف و عادت، رسم و رواج، اور سہولت کو کس حد تک ملحوظ رکھا ہے اسے واضح کرنے کے لیے کسی فنی بحث و تبصرہ سے زیادہ مفید ہوگا کہ ان کی عملی زندگی سے ایک مثال پیش کر دی جائے کہ کسی کا عمل ہی اس کے بارے میں سب سے بڑی سند ہوتا ہے۔ امام صاحب کی علمی و فقہی مجالس میں جہاں مختلف علوم و فنون کے بڑے بڑے امام شامل ہوتے تھے، وہاں امام صاحب نے ایسے سمجھدار اور ذہین لوگوں کی اچھی خاصی تعداد کو بھی اپنی مجالس میں شریک کر رکھا تھا جو اپنے علاقوں کے عرف، رسم و رواج اور رہن سہن سے بخوبی واقف تھے، یہ لوگ پابندی سے امام ابو حنیفہ کی مجالس میں حاضر ہوتے اور ان کو مختلف علاقوں کے رسم و رواج اور عوام کے معاشرت و معاملاتی طور و طریق سے آگاہ کرتے۔ امام صاحب ان لوگوں کی مالی کفالت کرتے تھے، اور ان کو باقاعدہ وظائف دیتے تھے۔ ان کے علاوہ مجلس تدوین فقہ کے دوسرے بہت سے ارکان کی بھی ابو حنیفہ مستقل مالی امداد کرتے تھے۔ حتی کہ آپ کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد ایسی تھی جو مستقل طور پر آپ کے پاس رہتی تھی اور اس کی تمام تر معاشی ذمہ داریاں آپ کے سر تھیں۔ اس مقصد کی خاطر آپ نے اپنے کاروبار کا ایک حصہ مخصوص کر رکھا تھا اور اس سے یہ تمام اخراجات پورے کرتے تھے۔

امام ابو حنیفہؒ نے اس دور میں جسے آج دنیا ترقی یافتہ دور کہتی ہے، اپنے مشن کی تکمیل کے لیے وہ انداز اور طریق کار اختیار کیا جسے آج تیرہ سو برس بعد صرف بعض ترقی یافتہ اور مال دار حکومتیں اپنانے پر قادر ہیں اور اس کے مفید نتائج و ثمرات سے بہرہ ور ہو رہی ہیں۔

ابو حنیفہ کے اصولِ اجتہاد کیا تھے۔؟ ان کے بارے میں خود ان کی اپنی وضاحت یہ ہے:

> "میں سب سے پہلے کتاب اللہ کی طرف رجوع کرتا ہوں، اگر وہاں مسئلہ کا کوئی حکم نہیں ملتا تو پھر سنت رسول کی طرف رخ کرتا ہوں، اگر ان دونوں مصادر میں بھی حکم نہ ملے تو اقوالِ صحابہ تلاش کرتا ہوں، جس

صحابی کا جو قول حسبِ موقع ہوتا ہے اسے لے لیتا ہوں، نہیں ہوتا تو چھوڑ دیتا ہوں۔ اقوالِ صحابہ کے دائرے سے باہر قدم نہیں نکالتا۔ لیکن جب معاملہ صحابہ سے نکل کر ابراہیم، شعبی، ابن سیرین، عطاء اور سعید بن مسیّب (رحمہم اللہ) تک پہنچتا ہے تو پھر بات یہ ہے کہ یہ لوگ بھی اجتہاد کرتے تھے، اور میں بھی ان کی طرح اجتہاد کرتا ہوں"۔ (۷)

مناقبِ امام اعظم میں مکی لکھتے ہیں:

"امام ابو حنیفہ کتاب اللہ کے بعد متفق علیہ حدیث کو تلاش کرتے، حدیث نہ ملتی تو قیاس سے کام لیتے، اس کے بعد استحسان کو کام میں لاتے، حل مسائل کے لیے جمہور مسلمین کے عرف اور تعامل سے مدد لینے میں بھی تامل نہیں کرتے تھے، قیاس اور استحسان میں سے جو مصلحتِ عامہ کے لیے زیادہ مفید ہوتا اسے اختیار کرتے۔ لوگوں کے معاملات ومسائل پر ان کی گہری نظر تھی، وہ ہمیشہ ان کی سہولت اور فلاح کے جویا رہتے اور امکانی حد تک قباحت اور دشواری سے گریز کرتے"۔ (۷)

مکی ہی کا کہنا ہے:

"امام ابو حنیفہ حدیث کے ناسخ و منسوخ میں انتہائی تفحص سے کام لیتے تھے، جو حدیث رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہو جاتی اس پر عمل کرتے۔ اہل کوفہ کی حدیثوں کو ان سے بڑھ کر پہچاننے والا کوئی نہ تھا، وہ سختی کے ساتھ حدیث کا اتباع کرنے والے تھے"۔ (۸)

ابن عبد البر نے بھی اپنی کتاب الانتقاء میں امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں ایسا ہی کچھ نقل کیا ہے۔ (۹)

ان تینوں وضاحتوں سے امام صاحب کے علم، اور طرزِ استدلال کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان تین روایتوں کے علاوہ اور بھی بہت سی روایات ہیں جو امام صاحب کے مصادر فقہ کی نشان دہی کرتی ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر ان میں کوئی فرق اور تناقض نہیں ہے۔

تاریخ بغداد اور الانتقاء سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابو حنیفہ اختلاف صحابہ کی صورت میں ان کے دائرہ اقوال میں رہتے ہوئے کسی ایک قول سے تمسک کرتے تھے، جو ان کے نزدیک کتاب و سنت سے استنباط میں مطابقت رکھتا ہو، اور قیاس سے مربوط ہو۔(۱۰)

دوسری تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کتاب اللہ یا سنت رسول میں کوئی نص نہ ملتا تو قول صحابی اختیار کرتے، وہ بھی نہ ملتا تو قیاس سے کام لیتے، پھر استحسان سے، اور اس کے بعد لوگوں کے عرف و عادت کو بنیاد بناتے۔ ان تصریحات سے یہ معلوم ہوا کہ ان کے شہر میں جو فقہی تعامل ہوتا اس کو بھی حل مسائل میں دلیل اور مآخذ کے طور پر استعمال کرتے۔ اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک جو فقہی دلائل اور مصادر قابل قبول اور قابل عمل تھے، وہ سات تھے: ۱۔ کتاب اللہ، ۲۔ سنت رسول اللہ ﷺ، ۳۔ اقوال صحابہ، ۴۔ اجماع، ۵۔ قیاس، ۶۔ استحسان، ۷۔ عرف و عادت۔(۱۱)

## ۳۔ سنت سے استدلال

قرآن اور سنت تمام ائمہ کے نزدیک اخذِ احکام کے اولین اور بنیادی مصادر ہیں، نہ ان کی اولیت میں کسی کی دورائیں ہیں، اور نہ ان کی حجیت میں کسی کا کوئی اختلاف، لیکن ان دو بنیادی اور متفقہ مصادر سے احکام اخذ کرنے، اور ان سے استدلال کے طریقے میں امام ابو حنیفہ اور دوسرے ائمہ مجتہدین میں بہت فرق ہے۔ خاص طور پر سنت سے استدلال میں۔ استدلال کے اس فرق سے استنباطِ احکام میں بہت فرق پڑتا ہے، سنت سے استدلال میں ابو حنیفہ نے جو منفرد روش اختیار کی ہے، اس سے بھی ان کی وسعتِ فکر و نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

حقیقت میں یہ وہ مرحلہ ہوتا ہے جب ایک ہی مسئلہ میں روایات مختلف ہو جائیں۔ اس قسم کے مواقع پر دوسرے ائمہ کے مقابلے میں امام ابو حنیفہ کا طرزِ استدلال کہیں زیادہ عقلی اور سائنٹیفک ہے، اور بلاشبہ اس میں پیش آمدہ، اور نوبہ نو مسائل کے حل کی زیادہ گنجائش اور صلاحیت ہے۔

اختلافِ روایات کے وقت ائمہ کا طرزِ استدلال کیا ہوتا ہے۔؟ اس کی وضاحت دو مثالوں سے کرنا چاہوں گا۔

تعارضِ روایات کے وقت امام شافعی روایت کی سند پر زیادہ نظر کرتے ہیں، اور جس روایت کی سند زیادہ قوی اور صحیح ہوتی ہے (اصولِ روایت کے اعتبار سے) اسی روایت کو وہ اپنے مسلک کی اساس قرار دیتے ہیں۔ اور دوسری روایت جو اس کے خلاف ہو، اور جس کی سند نسبتاً ضعیف ہو، اسے ترک کر دیتے ہیں، یا اسے مرجوح قرار دیتے ہیں، یا اس کی توجیہ کرتے ہیں۔

امام مالک کو ایسی صورتِ حال پیش آتی ہے تو وہ اہلِ مدینہ کے عمل کو دیکھتے ہیں، اور جس روایت کے مطابق ان کا عمل ہوتا ہے، اس پر اپنے مسلک کی بنیاد رکھتے ہیں، اور دوسری روایات کی توجیہ کر لیتے ہیں۔

امام احمد بن حنبل بھی عملِ سلف کو دیکھتے ہیں، یا ان کی نظر سند پر ہوتی ہے۔امام ابو حنیفہ کا طریق کار ان سے مختلف ہے، ان کا اصول یہ ہے کہ :

ایک معاملہ میں جتنی روایات آئی ہیں، یا قابلِ حجت ہیں، وہ ان سب کو سامنے رکھ کر، غور و فکر کر کے اور سیاق سباق کو مدِ نظر رکھ کر حضور علیہ السلام کے فرمان کی غرض و غایت اور علت کا پتہ لگاتے ہیں۔ اور ذوقِ اجتہاد سے یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ اس حکم سے نبی علیہ السلام (شارع) کا منشاء کیا ہے۔ یہ منشاء جس روایت سے زیادہ واضح ہوتا ہے اسی کو اپنے مسلک کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ وہ روایت سند کے لحاظ سے کچھ کمزور ہی کیوں نہ ہو۔ اور باقی روایات کو اس طرح کلی غرض و غایت سے جوڑتے چلے جاتے ہیں کہ وہ ساری روایتیں اپنے اپنے محل پر چسپاں نظر آنے لگتی ہیں، اور واضح ہوتا ہے کہ تمام روایات میں مسئلہ ایک ہی ہے، مگر کسی روایت میں اس کا حکم ہے۔ کسی میں حکمت ہے، کسی میں کیفیت، اور کسی میں اس کی غرض و غایت، غرض روایات کو جوڑ کر اس میں شارع کا منشاء تلاش کر کے اس کو ترجیح دینا، یہ امام ابو حنیفہ کا طریقِ اجتہاد ہے۔ اور اس اندازِ فکر سے غرض یہ ہے کہ نبی علیہ السلام کے حکم کا کوئی پہلو ایسا نہ رہے جس پر اس کے سیاق و سباق اور منشاء کے

مطابق عمل نہ ہو۔

مثلاً سفر کے روزہ کے بارے میں مختلف روایتیں منقول ہیں، کسی حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سفر میں روزہ رکھنا افضل ہے، حمزہ ابن عمرو اسلمی کی روایت میں ہے کہ انہوں نے حضورﷺ سے پوچھا: یا رسول اللہ: کیا سفر میں روزہ رکھنا گناہ ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا:

"افطار کرنا اللہ کی طرف سے رخصت ہے جو اسے اختیار کرے گا تو یہ خوبی کی بات ہو گی، اور جو روزہ رکھنا پسند کرے، اس پر کوئی گناہ نہیں"۔ (۱۲)

اس حدیث میں افطار کو رخصت فرما کر اس کو حسن کہا گیا جس سے یہ معلوم ہوا کہ عزیمت روزہ رکھنا ہی ہے، البتہ افطار کرنا جائز ہے، سفر کی مشقت کی وجہ سے اس کی اجازت ہے۔ بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ افطار افضل ہے۔ جیسا کہ حضرت جابرؓ کی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ افطار افضل ہے۔ حضرت جابرؓ کی روایت میں ہے: کسی غزوہ کے موقع پر ہم حضورؐ کے ساتھ تھے حضورؐ نے ایک ہجوم کو دیکھا جو ایک شخص پر سایہ کیے ہوئے تھا۔ آپؐ نے پوچھا: یہ کیا ماجرا ہے؟ لوگوں نے کہا: ایک روزہ دار کی حالت گرمی کی وجہ سے بہت خراب ہو رہی ہے، اس لیے لوگ اس پر سایہ کیے ہوئے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: "سفر میں روزہ رکھنا کوئی نیکی کی بات نہیں ہے"۔

ایک اور حدیث ہے حضرت انسؓ سے، جس میں ہے کہ: ہم لوگ حضورؐ کے ساتھ سفر میں تھے، کچھ روزہ سے تھے اور کچھ بغیر روزہ کے تھے، جب منزل پر پہنچے تو جو لوگ روزہ دار تھے وہ تو نڈھال ہو کر گر پڑے اور کسی کام کاج کے قابل نہ رہے۔ اور جن لوگوں کے روزے نہ تھے انہوں نے خوب کام کیا، خیمے نصب کیے، جانوروں کی دیکھ بھال کی۔ حضورؐ نے یہ صورتِ حال دیکھ کر فرمایا: "بے روزہ لوگ ثواب سمیٹ کر لے گئے"۔ (۱۳)

اور بعض روایتوں میں روزہ رکھنے اور نہ رکھنے میں مطلقاً اختیار معلوم ہوتا ہے۔ یعنی

مسافر کی مرضی ہے۔ روزہ رکھے یا افطار کرے، دونوں امر برابر ہیں۔ حمزۃ ابن عمرو اسلمی ہی کی روایت ہے کہ حضورﷺ نے ارشاد فرمایا: چاہے سفر کی حالت میں روزہ رکھ لو اور چاہے افطار کر دو"۔(۱۴)

امام احمد بن حنبل نے حدیث انس کو اختیار کر کے کہا: سفر میں افطار افضل ہے، اس طرح انہوں نے افضلیتِ صوم، اور اختیار کی نفی کر دی بعض فقہاء نے مطلق تخییر کو اختیار کیا، افضلیت صوم اور افضلیتِ افطار، دونوں کی نفی کر دی۔ ایسا اس لیے ہوا کہ ان حضرات کے یہاں معیارِ انتخاب، حدیث کی سند ہے یا سلف کا تعامل ہے۔ لیکن امام ابو حنیفہ نے روایات کی تطبیق و توفیق کو بنیاد بنایا، تینوں قسم کی روایات کو جمع کیا اور سب کو قابل عمل بنایا اور کسی ایک جہت کی بھی نفی نہیں کی انہوں نے نور اجتہاد سے یہ دیکھا کہ ان مختلف روایات سے شارع کی غرض مختلف احکام دینا ہے نہ کہ ایک حکم سے دوسرے کی نفی کرنا مقصود ہے۔ لہذا ابو حنیفہ نے تخییر کی حدیث کو مساوات فی الجواز پر محمول کیا کہ اس سے شارع کی غرض صوم و افطار دونوں کو بلا کراہت جائز بتلانا ہے۔ یعنی روزہ رکھنے اور نہ رکھنے کے جواز میں کوئی فرق نہیں۔ اور جس روایت میں صوم کی افضلیت ہے اس کو کوفی حد ذاتہ صوم کی افضلیت پر محمول کیا کہ اصلاً روزہ رکھنا ہی افضل ہے، کیونکہ رمضان روزہ ہی کا مہینہ ہے، اس میں افطار کسی طرح بھی افضل نہیں ہو سکتا۔ اور افطار کی افضلیت والی روایت کو عوارض پر محمول کیا، یعنی جب سفر میں تکلیف اور پریشانی در پیش ہو اور روزہ رکھنے میں معمول سے زیادہ تعب اور مشقت ہو تو پھر عارضی اور وقتی طور پر افضلیت افطار میں ہوئی۔

خلاصہ یہ نکلا کہ : تخییر (اختیار دینا) نفس جواز میں ہوئی، اور روزہ رکھنے کی افضلیت وقت (ماہ رمضان) اور اصل کے اعتبار سے ہوئی، اور صائم کے احوال و عوارض کے اعتبار سے افطار کی افضلیت ہوئی۔ تو شارع نے تینوں حالتوں کا ذکر و حکم بیان فرما دیا کیونکہ صائم پر یہی تین حالتیں پیش آسکتی ہیں۔ ان تینوں حالتوں کی تفسیر نے تمام روایات کو ایک نقطہ پر جمع کر کے ان کے تعارض کو اٹھا دیا، تخییر بھی باقی رہی، اور افضلیت صوم بھی باقی رہی اور افضلیت افطار بھی، کسی ایک حکم سے دوسرے حکم کی نفی نہیں ہوئی۔ امام صاحب نے ساری

حدیثوں کو جمع کر کے قابل عمل بنا دیا۔ یہی ان کے اجتہاد اور طرزِ استدلال کی خوبی اور انفرادیت ہے۔

لو شمعِ حقیقت کی اپنی ہی جگہ پر ہے
فانوس کی گردش سے کیا کیا نظر آتا ہے

متضاد اور متعارض روایات میں امام ابو حنیفہ کا ایک خاص اصول، اور طرز یہ بھی ہے کہ وہ کسی باب کی ایسی حدیث کو جو کلی طور پر عمومی ضابطے کا رنگ لیے ہوئے ہو، اصل قرار دے کر اس باب کے جزئی افعال کو جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہوں اور کلیہ کے خلاف پڑتے ہوں۔ اس کلیہ کے تابع کرتے ہیں اور کلیہ کو ان افعال جزئیہ کے سبب توڑنا پسند نہیں کرتے کیونکہ اس کا سبب اور علت دونوں معلوم اور واضح ہوتے ہیں۔ نیز یہ کہ جزئی افعال واقعۂ حال ہوتے ہیں۔ اور ان میں کوئی عموم نہیں ہوتا۔ کلیہ کو اصلیت پر باقی رکھ کر ان جزئی واقعات کی کوئی ایسی توجیہ کر دیتے ہیں کہ وہ اس کلیہ کے مخالف نہ رہیں۔ مخلاف دوسرے ائمہ کے کہ وہ جزئیات کی محض سندی قوت دیکھ کر ان سے کلیہ کی تخصیص کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

مثلاً :

آدابِ خلاء کے سلسلے میں ابو ایوب انصاریؓ کی حدیث میں ایک کلیہ بیان کیا گیا :

''اذا اتیتم الغائط فلا تستقبلوا القبلة ولا تستدبروها ولكن شرقوا او غربوا۔(۱۵)

(جب تم قضائے حاجت کے لیے جاؤ تو نہ قبلہ رخ ہو کر بیٹھو اور نہ قبلہ کی طرف پشت کر کے بیٹھو، بلکہ مشرق کی طرف رخ کرو یا مغرب کی، (تاکہ قبلہ دائیں یا بائیں جانب رہے)۔

یہ ایک عام حکم ہے جس میں استقبال اور استدبار کو کسی مکان کے ساتھ مقید نہیں کیا گیا کیوں کہ یہ حکم بیت اللہ کی عظمت و حرمت کے سبب دیا گیا ہے تاکہ مکروہ افعال کے وقت قبلہ کا استقبال اور استدبار نہ ہو کہ وہ بیت اللہ کی توہین ہے۔ اور بیت اللہ کی تعظیم ہر

صورت میں اور ہر زمان و مکان میں مطلوب ہے۔ چنانچہ حکم کی یہ علت ایک دوسری حدیث میں موجود بھی ہے۔

اذا اتیٰ احد کم البراز فلیکرم قبلة الله عزو جل فلا یستقبل القبلة(۱۶)

پس جب کہ اکرام بیت اللہ کی علت سے بحالت بول براز استقبال و استدبار قبلہ ممنوع تھا اور یہ علت فی نفسہ مطلوب ہونے کے سبب کسی قید سے مقید نہ تھی تو امام ابو حنیفہ نے مذہب کی اساس اسی کلیہ کو قرار دے کر مطلقاً استقبال و استدبار کی حرمت کا فتویٰ دے دیا خواہ مکان ہو، میدان ہو، یا جنگل۔ اس حدیث کو ایک کلی ضابطہ قرار دیا مگر اس کلیہ کے خلاف حضور کے افعال ثابت ہوئے جیسا کہ ابن عمر کی روایت ہے کہ : میں نے حضرت حفصہؓ کے مکان کی چھت پر حضورﷺ کو مستدبرِ قبلہ پیشاب کرتے ہوئے دیکھا۔ امام صاحب نے اپنے ذوقِ خاص سے جن کا ذہن کلی ضابطوں اور تعلیمات کی طرف بہت تیزی کے ساتھ منتقل ہوتا ہے، اس جزئیہ کی ایسی توجیہات فرما دیں کہ وہ اس کلیہ کے خلاف نہ رہے۔ کیوں کہ کلیہ کا حکم جس علت پر مبنی ہے یعنی تکریم بیت اللہ، وہ مکان اور صحرا یا کوئی بھی مقام ہو، ہر جگہ موجود ہے۔ تو اس کو کسی ایسے جزئی واقعہ سے کیوں توڑا جائے جس کی نہ علت کا پتہ ہو نہ سبب کا، لیکن ائمہ نے اس کلیہ کو زیادہ اہمیت نہیں دی بلکہ امام شافعی نے جزئی واقعہ سے کلیہ کی تخصیص کی اور کہا کہ : استقبال و استدبارِ قبلہ، عمارت میں جائز، اور صحراء میں ناجائز۔ "امام احمد بن حنبل نے کہا: استقبال ہر جگہ ناجائز اور استدبار ہر جگہ جائز ہے۔ بہر کیف یہ اختلاف، اصولِ استنباط کے اختلاف کی بنا پر ہے۔ دوسرے ائمہ نے حدیث کے ظاہری حکم پر نظر کی اور اس کو اولیت دی، اور ابو حنیفہ نے حکم کی علت اور سبب کو بنیاد قرار دیا۔ امام صاحب نے جو طرزِ استدلال اپنایا وہ بلاشبہ زیادہ عقلی اور جامعیت کا حامل ہے۔

## ۴۔ فقہِ تقدیری

"فقہِ تقدیری" فقہِ حنفی ایک اہم خصوصیت ہی نہیں، میرے نزدیک امتِ مسلمہ پر بہت بڑا احسان ہے۔ فقہِ تقدیری کے معنی یہ ہیں کہ مسائل کے پیش آنے سے پہلے ان

مسائل کے حل کی طرف توجہ دی جائے جو ابھی پیش نہیں آئے۔ لیکن ان کے پیش آنے کا امکان موجود ہے۔ فقہائے حجاز، عقلی امکانات کے تفحص اور ان میں غور وفکر سے اپنے آپ کو دور رکھتے تھے، وہ مسائل کو بہت سادہ انداز میں حل کرنے کے قائل تھے، جو مسائل ابھی پیش ہی نہیں آئے، ان کا حکم معلوم کرنے کو وہ اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن ان کے برخلاف عراقی فقہاء تھے، نکتہ سنجی، دور اندیشی، طلب و تفحص، اور مقاصدِ شریعت کا ادراک، ان کے مزاج کا حصہ تھا۔ اور یہ ایک طرح ان کی مجبوری تھی۔ کیوں کہ ان کا تہذیبی اور معاشرتی ڈھانچہ حجاز کی طرح سادہ نہ تھا، اس میں تنوع تھا، رنگا رنگی تھی، اسلامی حکومت میں نئی نئی قوموں اور علاقوں کی شمولیت سے مسائل کا جنگل اُگ رہا تھا۔ فقہِ تقدیری کے بغیر ان کا حل معلوم کرنا، اور بر وقت ان سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہ تھا۔ جن حضرات محدثین کی پوری توجہ نصوص کے ظاہر پر مرتکز تھے، انہوں ابو حنیفہ پر تنقید کی، اگرچہ خلوص کے ساتھ، لیکن اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ فقہِ تقدیری کی گہرائی اور گیرائی کو نہ ناپ سکے۔ حالانکہ نصوصِ حدیث میں خود فقہِ تقدیری کی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً: جب نبی اکرم ﷺ نے فتنۂ دجال کے ظہور اور اس وقت دن و رات کی غیر معلوم وسعت کا ذکر فرمایا تو صحابہ نے پوچھا: یا رسول اللہ۔؟ اس وقت نمازیں ادا کرنے کی کیا صورت ہو گی۔ لوگ روزہ کیسے رکھیں گے۔؟ غور کیجئے یہ قبل از وقوع مسائل کا حل تلاش کرنا نہیں تھا تو اور کیا تھا۔؟

فقہِ تقدیری کے بارے میں فقہائے حجاز اور فقہائے عراق کے نقطۂ نظر کا فرق صرف ایک واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے جسے خطیب بغدادی نے نقل کیا ہے۔ قتادہ جب کوفہ آئے تو غائب شخص کی بیوی اور اس کے مہر کے بارے میں امام ابو حنیفہ سے ان کی گفتگو ہوئی۔ قتادہ نے ابو حنیفہ سے پوچھا: کیا ایسا کوئی واقعہ پیش آیا ہے۔؟ ابو حنیفہ نے نفی میں جواب دیا، قتادہ نے کہا۔ جب ابھی واقعہ پیش نہیں آیا تو پھر اس کا حکم معلوم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔؟

حقیقت یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ نے اپنے فقہی مسلک میں انسان کی عملی زندگی اور ضروریات کو جتنی وسعت اور جامعیت کے ساتھ پیشِ نظر رکھا ہے، دوسرا کوئی بھی فقہی

مسلک نہیں رکھ سکا۔ عواہ کے بدلتے ہوئے رسم و رواج اور عرف و عادت پر گہری اور وسیع نظر کا نتیجہ تھا کہ ابو حنیفہ نے قیاس سے بھی ایک قدم آگے بڑھایا، اور پیدا شدہ مسائل کا حکم معلوم کرنے کے لیے ایک انتہائی ترقی یافتہ اور عقلی ضابطہ ایجاد کیا، جسے انہوں نے ''استحسان'' کا نام دیا۔ انہیں مفروضوں کا حکم معلوم کرنے کی لگن اور جستجو بھی اس لیے تھی کہ وقت کی طرح انسانی زندگی بھی رواں دواں ہے، اس کا پہیہ رکتا نہیں ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اسلام جو عالمگیر اور دائمی دستور حیات ہونے کا داعی ہے، وہ انسانی زندگی سے کسی مرحلہ پر بھی پیچھے نہ رہے، ہر موڑ پر اس کی راہ نمائی کرتا رہے، اور ہر مشکل وقت میں اس کے مسائل کی گتھیاں سلجھاتا رہے۔(۱۷)

حقیقت یہ ہے کہ حنفی اصول کی بنیاد ہی اس بات پر ہے کہ : ''یرید اللہ بکم لیسر ولا یرید بکم العسر'' کا الٰہی منشا پورا کیا جائے۔ عوام کو سختی اور تنگی سے بچایا جائے اور ان کے لیے اس حد تک، جہاں تک قرآن و سنت نے اجازت دی ہے سہولت اور آسانی پیدا کی جائے۔

امام ابو حنیفہ نے جن مسائل کو اس وقت حل کیا، آج بارہ سو، تیرہ سو برس گزرنے کے بعد قومیں انہیں حل کر کے انسانی حقوق کے تحفظ کی علم بردار بن رہی ہیں۔ مسلم فقہاء نے، اور بطور خاص امام ابو حنیفہ نے ایسے جامع اصول وضع کر دیئے تھے جن کی روشنی میں قیامت تک پیش آنے والے مسائل کا حل تلاش کیا جاتا رہے گا، فرضی جزئیات کی بنیاد پر اصول وضع کرنے پر جب امام صاحب سے سوال کیا گیا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ جب ایک مسئلہ ابھی پیش ہی نہیں آیا تو پھر اس کا حل تلاش کرنے کے کیا معنی؟ تو ابو حنیفہ نے یہ جواب دیا: ''اہل علم کو چاہیئے کہ جن معاملات میں لوگوں کے مبتلا ہونے کا امکان ہے ان کا حل وہ ابھی سے سوچ رکھیں۔ تاکہ اگر وہ کسی وقت پیش آجائیں تو لوگوں کے لیے کوئی انوکھی بات نہ ہو، وہ ذہنی اور عملی طور پر تیار ہوں کہ اسلامی شریعت کی رو سے اس معاملہ میں کیا کرنا ہے۔ اور اس مشکل میں شریعت نے ان کے لیے عمل کی کون سی راہ معین کی ہے۔؟ اس لیے ہم ابتلاء اور آزمائش سے پہلے ہی اس کا حل تلاش کرنے کی کوشش

کرتے ہیں"۔(۱۹)

## ۵۔ یُسر و سہولت

اس الٰہی منشاء کو پورا کرنے کے لیے ابو حنیفہ نے اولین اور بنیادی کام یہ کیا کہ فرض، اور حرام کے دائرے کو محدود کیا۔ فرض اور حرام۔ شریعت کے دو ایسے احکام ہیں جن پر پابندی کے لیے سب سے زیادہ سختی اور تاکید ہے۔ مثلاً امتِ مسلمہ کا اجماعی عقیدہ ہے کہ فرض کا انکار کفر، اور اس کا ترک فسق ہے، اب اگر فرض اور حرام کا دائرہ وسیع ہوگا تو لوگ اتنے ہی زیادہ مشکل اور تنگی میں مبتلا ہوں گے، اور ان کے دائرے کو جتنا تنگ کریں گے لوگوں کی دشواریاں اتنی ہی کم ہوں گی۔ امام ابو حنیفہ نے فرض اور حرام کی تعریفات میں سخت قیدیں لگا کر ان کا دائرہ کم سے کم کرنے کی کوشش کی ہے، ان کے نزدیک فرض یا حرام ایسے نص سے ثابت ہو گا جو ثبوت اور دلالت دونوں میں قطعی اور حتمی ہو، اگر دونوں میں سے کسی ایک چیز کی قطعیت مشکوک اور مبہم ہو جائے تو فرضیت یا حرمت ثابت نہ ہو سکے گی۔ دوسرے ائمہ کے یہاں فرض اور حرام کے ثبوت کے لیے اتنی کڑی شرائط نہیں ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے فقہی مسالک میں فرائض کی تعداد بھی زیادہ ہے اور محرمات کی بھی۔ جبکہ فقہِ حنفی میں نسبتاً کم ہے جس سے عوام کو سہولت اور آسانی ہے۔ اور اس طرح کم سے کم لوگوں پر کفر اور فسق کی مہر لگانے کی نوبت آتی ہے۔

## ۶۔ مسلمان کی طرف گناہ کی نسبت سے اجتناب

فقہِ حنفی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں فعلِ مسلم کو امکانی حد تک حرمت کی نسبت سے بچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جب تک فعلِ مسلم کو حلال کے دائرے میں رکھنا ممکن ہوگا، رکھا جائے گا۔

امام کرخی کہتے ہیں:

> "مسلمانوں کے اعمال و افعال اور معاملات، صلاح و درستگی پر محمول کیے جائیں گے۔ یہاں تک کہ اس کی مخالف سمت ثابت ہو جائے۔ مثلاً کوئی شخص، ایک درہم اور دینار، دو درہم اور دو دینار کے بدلے فروخت کر

دے تو یہ معاملہ جائز ہو گا۔ اور ایک درہم کو دو دینار، اور ایک دینار کو دو درہم کے مقابل سمجھا جائے گا"۔

دوسرے احکام کے علاوہ خاص طور پر دو مسائل ہیں جن میں بسہولت اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک تکفیر کا مسئلہ، دوسرے ثبوتِ نسب کا، کسی مسلمان پر کفر کا فتویٰ لگائے جانے اور دائرۂ اسلام سے خارج کیے جانے میں امام ابو حنیفہ کس درجہ محتاط تھے، اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے جو ابن نجیم نے "الاشباہ والنظائر" میں نقل کیا ہے کہ آپ سے ایک ایسے شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جو کہتا تھا کہ مجھے جنت کی امید نہیں، جہنم کا اندیشہ نہیں، خدا سے ڈرتا نہیں ہوں، قرأت اور رکوع وسجدہ کے بغیر نماز پڑھ لیتا ہوں اور ایسی چیز کی شہادت دیتا ہوں جسے دیکھا تک نہیں، حق کو ناپسند کرتا ہوں، فتنہ کو پسند کرتا ہوں، آپ کے اصحاب نے کہا کہ اس شخص کا معاملہ تو بہت مشکل ہے، لیکن امام صاحب نے ان تمام باتوں کی توجیہ فرمائی، فرمایا: کہ جنت کے امید وار نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی رضا کا امید وار ہوں اور جہنم سے نہ ڈرنے کا مطلب یہ ہے کہ صرف اللہ سے ڈرتا ہے، اللہ سے نہ ڈرنے کا مطلب یہ ہے کہ خدا سے ظلم کا خطرہ نہیں، مردار کھانا، "مچھلی کھانے اور ٹڈی کھانے" سے عبارت ہے، بغیر رکوع و سجدہ اور قرأت کے نماز سے مراد جنازہ ہے، بن دیکھی گواہی توحید کی گواہی ہے، حق سے بغض رکھنے سے مراد موت کو ناپسند کرنا ہے کہ موت ہی سب سے بڑی حقیقت ہے، فتنہ سے محبت کے معنی اولاد سے محبت ہے کیوں کہ اولاد کو قرآن نے فتنہ قرار دیا ہے، چنانچہ استفسار کرنے والا کھڑا ہوا۔ امام ابو حنیفہ کی جبینِ فراست کو بوسہ دیا اور عرض کیا کہ یقیناً آپ ظرفِ علم ہیں "اشهد انك للعلم وعاء"(۲۰)

اسی طرح ثبوت نسب کے معاملہ میں بھی ابو حنیفہ نے ممکن حد تک احتیاط اور زنا کی طرف انتساب سے بچانے کی کوشش کی ہے، قاضی ابو زید دبوسی نے لکھا ہے:

الاصل عند نا العبرة فی ثبوت النسب لصحة الفراش وكون الزوج من اهله لا بالتكمن بالوطی وعند الشافعی العبرة فی

النسب التمكن من الوطی حقیقة"۔(۲۱)

(ہمارے یہاں اصل یہ ہے کہ ثبوت نسب کے لیے فراش کا صحیح ہونا اور شوہر کا اہل ہونا کافی ہے، فی الواقع وطی کا امکان ضروری نہیں، امام شافعی کے نزدیک ثبوت نسب میں وطی کا عملی طور پر امکان ضروری ہے)۔

چنانچہ وقت نکاح سے ٹھیک چھ ماہ بعد ولادت ہو تب بھی ابو حنیفہ کے یہاں نسب ثابت ہو جائے گا۔

## شخصی آزادی کا احترام :

امام ابو حنیفہ کے اجتہادی قواعد میں شخصی آزادی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ آپ نے ہر پہلو سے فرد کی آزادی کا تحفظ کیا ہے، آپ کا عقیدہ تھا کہ بیرونی مداخلت کے بجائے اخلاقی قوتوں کو بیدار کر کے کردار سازی کا عمل انجام دیا جائے۔ یہ طریقِ کار دعوتِ قرآن کی بھر پور ترجمانی ہے۔ مطالعۂ قرآن بھی انسان کو اسی نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ فرد کی اصلاح بیرونی دباؤ سے ممکن نہیں، وہ صرف انسان کے داخلی احساس کے ذریعے ہی ہو سکتی ہے، اسی داخلی احساس کو قرآن "تقویٰ" سے تعبیر کرتا ہے۔

مثلاً امام ابو حنیفہ نے ایک عاقل، بالغ اور آزاد لڑکی کو یہ اختیار دیا کہ وہ اپنا نکاح خود کر سکتی ہے جب کہ دوسرے ائمہ ولی اور سر پرست کے بغیر اسے یہ اختیار نہیں دیتے۔(۲۲)

شریعتِ اسلامیہ عورت کو ذمہ داریاں سونپتے ہوئے ہچکچاتی نہیں۔ عام اس سے کہ وہ ذمہ داریاں وجوب سے تعلق رکھتی ہوں یا ادا سے۔ یہ ذمہ داریاں زن و مرد میں مشترک ہیں، جو مالی حقوق اور ذمہ داریاں مرد کے لیے ہیں وہی عورت کے لیے بھی ہیں، اگر وہ سلجھی ہوئی باکردار، عاقلہ بالغہ ہے تو وجوبِ حقوق اور نفاذِ معاملات میں اسے پوری آزادی حاصل ہے، اسے تصرفات کا پورا اختیار ہے، شریعت اسے فیصلے اور ارادے میں وہ تمام آزادیاں دیتی ہیں جو تصرفات پر منتج ہوتے ہیں۔

فقہاء جب عورت کے لیے ان حقوق کی وضاحت کرتے ہیں تو اس میں اہلیت تامہ ماننے کے باوجود حریتِ مطلقہ نہیں دیتے، بلکہ اولیاء کو بھی شریک رکھتے ہیں۔

جمہور فقہاء اسی مسلک پر گامزن ہیں، مگر امام صاحبؒ نے تمام فقہاء کے خلاف مسلک اختیار کیا ہے اور اس آزادانہ رائے میں امام یوسفؒ کے سوا کوئی فقیہ ان کا ہم نوا نہیں ہے۔

امام صاحب فرماتے ہیں کہ عورت خود اپنے نکاح کے فرائض سر انجام دے سکتی ہے اور کوئی شخص اس کو مجبور نہیں کر سکتا، بشرطیکہ وہ کفو سے نکاح کرے اور مہر مثل سے کم حق مہر پر راضی نہ ہو، گو بہتر یہ ہے کہ کوئی ولی عقد کے معاملات سر انجام دے، لیکن اگر ایسا نہ کرے اور بذات خود معاملات سر انجام دے تو نہ یہ شریعت سے سرکشی ہو گی، اور نہ زیادتی، نہ معصیت، اس کا کلام نافذ ہوگا کیوں کہ وہ اپنا حق استعمال کر رہی ہے۔

اسی طرح شادی شدہ کنیز جب آزاد ہو جائے تو فقہ حنفی میں اسے یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ غلامی کے دور میں مالک کی طرف سے کیے ہوئے نکاح کو قائم رکھے یا اسے فسخ کر دے۔ قطع نظر اس سے کہ اس کا شوہر آزاد ہے یا غلام، دوسرے ائمہ یہ اختیار صرف اس صورت میں دیتے ہیں جب شوہر غلام ہو۔

فقہِ حنفی میں مدبّر، مکاتب، اور ام ولد کی بیع کو بھی ناجائز قرار دیا گیا ہے کیوں کہ انہیں مالک کی طرف سے ایک طرح آزادی کا حق حاصل ہو چکا ہے جسے کالعدم کرنا ایک فرد کی آزادی کو کچلنے کے مترادف ہے۔ جبکہ دوسرے ائمہ مدبر کی بیع کو جائز قرار دیتے ہیں۔

اسی طرح اگر کسی نے وصیت کے ذریعے متعدد غلاموں کو آزادی کا حق دے دیا تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک وہ سب آزاد ہو جائیں گے اگرچہ سب کی قیمت وصیت کرنے والے کے کل مال کے ایک تہائی سے زائد ہو، تہائی سے بڑھ جانے کی صورت میں ہر ایک بچہ اپنے حصہ کی زائد رقم ورثاء کو ادا کرے گا، ورثاء کو یہ حق حاصل نہ ہو گا کہ غلام کی طرف سے وراثت کے حصہ میں سے پوری رقم ادا نہیں ہو رہی اس لیے اس کی آزادی کو روک دے۔ دوسرے بعض ائمہ کہتے ہیں کہ ایسی صورت میں قرعہ اندازی کر لی جائے۔ اس طرح

بعض کو آزادی کا حق مل جائے گا اور بعض آزادی کی نعمت سے محروم رہ جائیں گے۔(۲۲)

آج کے ترقی یافتہ معاشرے اور مہذب اور جمہوری قوانین میں عام طور پر یہ دستور ہے کہ کسی مقدمہ کے دو فریقوں میں سے اگر ایک فریق غائب ہو، عدالت میں موجود نہ ہو تو یک طرفہ فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ اہل سنت کے مسالک میں بھی ایسے فیصلے کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ مگر حنفی مسلک میں ایسے فیصلے کو ناجائز کہا گیا ہے کیونکہ اس سے غیر حاضر کے حقوق پامال ہونے کا خطرہ ہے۔

فقہِ حنفی میں ہر عاقل بالغ انسان کو اپنی ملکیت میں تصرف کا پورا حق حاصل ہے۔ مثلاً : ایک لڑکے کے پاس مال و دولت ہے، بالغ نہ ہونے کی صورت میں اسے اپنی ملکیت میں تصرف سے روکا جا سکتا ہے۔ لیکن جب وہ بالغ ہو جاتا ہے تو پھر فقہِ حنفی کی رو سے عدالت کو یہ اختیار نہیں کہ وہ اسے اپنے مال میں تصرف کرنے سے روکے خواہ وہ اسے جائز خرچ کرے یا ناجائز، دوسرے فقہی مسلک میں عدالت کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ بالغ ہونے کے بعد اگر وہ فضول خرچی کا مرتکب ہوتا ہے تو اسے مال میں تصرف کرنے سے روک دیا جائے۔ یہ مسلک اختیار کرنے سے بھی ابو حنیفہ کا بنیادی منشاء یہ ہے کہ انسان کو جو حق اور آزادی عاقل و بالغ ہونے کے باعث حاصل ہو چکی ہے، کسی بیرونی قوت کو اسے ختم کرنے کا اختیار نہ دیا جائے۔

## احکام میں اسرار و حِکَم کی تلاش

فقہِ حنفی کو ایک قابل قدر خصوصیت یہ حاصل ہے کہ وہ جن مسائل کو زیر بحث لاتی ہے، اور ان کا حکم بیان کرتی ہے، ظاہری سیاق سباق سے زیادہ اس کے مصالح اور اسرار و حِکَم پر غور کرتی ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ شرعی احکام کے متعلق اسلام کے عہدِ اول ہی میں دو طبقے ہو گئے تھے۔ ایک گروہ کی رائے تھی کہ تمام احکام تعبدی ہیں یعنی ان میں کوئی سِر اور مصلحت تلاش کرنا ضروری نہیں، اللہ نے اور اللہ کے رسول نے جس چیز سے منع کیا ہے اس سے رک جانا چاہئے اور جس امر کے بجا لانے کا حکم دیا، اس کی بے چون و چرا تعمیل کرنی چاہئے۔ جھوٹ، خیانت، ظلم، فسق و فجور اور شراب نوشی اس لیے ناپسندیدہ

ہیں کہ شریعت نے ان سے منع کیا ہے۔ سچ، امانت و دیانت، عدل و رحم، صدقہ و خیرات اس لیے پسندیدہ میں شارع نے انہیں اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔

امام شافعیؒ کا رجحان اسی طرف پایا جاتا ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ شریعت کے تمام احکام مصلحتوں پر مبنی ہیں، کوئی حکم کسی راز اور مصلحت سے خالی نہیں ہے۔ بے شمار احکام ایسے ہیں جن کی مصلحت خود قرآن حکیم بیان کرتا ہے۔ کافروں اور منکروں کے مقابلے میں عموماً قرآن کا استدلال اسی انداز پر ہے کہ وہ جب کوئی حکم دیتا ہے، کوئی مسئلہ پیش کرتا ہے تو اس کے ساتھ اس کی مصلحت اور بنیادی مقصد کو بھی بیان کرتا ہے۔ نماز کی فرضیت و اہمیت کو بیان کیا تو اس کے ساتھ اس کا مقصد بھی واضح کیا کہ بے حیائی اور ناپسندیدہ باتوں سے روکتی ہے۔ روزہ کی فرضیت کا ذکر آیا تو یہ مصلحت بیان کی کہ انسان میں پرہیزگاری اور حسن اخلاق کی صفت پیدا ہو، جہاد کی نسبت کہا کہ: اللہ کی زمین سے بد امنی اور فتنہ و فساد ختم ہو، لوگ امن و سکون اور عزت و آبرو کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔ اسی طرح قرآن اور حدیث میں بے شمار احکام کے ساتھ ان کی مصلحتیں، مقاصد، اور غرض و غایت کی وضاحتیں موجود ہیں۔

امام ابو حنیفہؒ کا یہی مسلک تھا، انہوں نے نصوص کے علاوہ جن مسائل میں اجتہاد و استنباط کیا ہے وہاں شریعت کے مقصد اور عوام کے مصلحت کو ملحوظ رکھا ہے۔ ان کے اسی اندازِ استدلال کا یہ نتیجہ اور اثر ہے کہ تمام مسالکِ فقہ میں ان کی فقہ عقلی اصول، اور طرزِ استدلال کے زیادہ قریب ہے۔ امام طحاویؒ (م: ۳۲۱ھ) نے جو محدث بھی تھے، اور مجتہد بھی، اور حنفی المسلک تھے "شرح معانی الآثار" کے نام سے ایک مستقل اور ضخیم کتاب لکھی ہے، اور مرکزی موضوع اسی بات کو بنایا ہے کہ فقہِ حنفی، حدیث اور عقلی استدلال دونوں کے مطابق ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے مشہور شاگرد امام محمدؒ نے بھی اپنی تصنیف "کتاب الحجج" میں فقہِ حنفی کے اکثر مسائل پر عقلی انداز سے استدلال کیا ہے۔

حنفی مسلک کے مطابق لکھی جانے والے کتاب "الہدایہ" کا انداز بھی یہی ہے۔ جہاں ابو حنیفہؒ نے باقی ائمہ مجتہدین سے اختلاف کیا ہے وہاں صاحب ہدایہ حنفی مسلک کی

تائید میں ایک دلیل قرآن یا سنت سے دیتے ہیں، اور ایک دلیل خالصتاً عقلی نقطۂ نظر سے پیش کرتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ کی آراء کو عقلی انداز میں ثابت کرنے اور دوسرے مسالک پر ترجیح دینے میں ہدایہ کا اسلوب اور طریقِ کار بذاتِ خود انتہائی عقلی اور منطقی ہے۔

گذشتہ صدی (چودھویں صدی ہجری) میں برصغیر پاک و ہند کے عالم دین اور محدث مولانا ظفر احمد عثمانی (م: ۱۹۷۴ء) نے اسی طرز پر "اعلاء السنن" کے نام سے بائیس جلدوں پر مشتمل ایک ضخیم کتاب لکھی، اس میں بھی ابو حنیفہ کی فقہی آراء اور اجتہادات کی وجوہِ ترجیح دلائل کی مدد سے بیان کی ہیں۔

فقہِ حنفی کے مسائل کا دوسرے فقہی مسائل سے موازنہ کیا جائے تو یہ فرق صاف نظر آتا ہے، معاملات تو معاملات، عبادات میں بھی جن کے بارے میں ظاہر بینوں کا خیال ہے کہ ان میں عقل کا کوئی کام نہیں، ابو حنیفہ نے وہاں بھی عقل کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ انہوں نے احکام کا جس انداز سے تجزیہ کیا ہے وہ عقل کے عین مطابق ہے۔

نماز، روزہ، زکوٰۃ، اور حج اسلام کے بنیادی ارکان ہیں، اگر اس نقطۂ نظر سے غور کیا جائے کہ شریعت نے ان اعمال کی بجا آوری کن مصلحتوں کی بنا پر فرض کی ہے، اور ان کی بجا آوری کا کیا طریقہ ہونا چاہئے تو بلا شبہ وہی طریقہ سب سے زیادہ موزوں، سہل، اور عقلِ سلیم کے مطابق ثابت ہو گا جو فقہِ حنفی میں معین کیا گیا ہے۔ مثلاً نماز چند افعال کے مجموعہ کا نام ہے۔ لیکن اس لحاظ سے کہ نماز کی اصل غرض و غایت کیا ہے۔؟ یعنی خشوع و خضوع، اظہارِ بندگی، اللہ کی بڑائی اور بزرگی کا اقرار، دعاء، ان مقاصد کو حاصل کرنے میں نماز کے کس عمل کی کیا حیثیت ہے، اور ان کے مراتب میں کس حد تک تفاوت ہے۔؟ ان افعال میں بعض اس حد تک ضروری ہیں کہ ان کے چھوٹ جانے سے نماز کی بنیادی غرض و غایت ہی ختم ہو جاتی ہے، ایسے افعال کو شریعت کی زبان میں "فرض" سے تعبیر کیا جاتا ہے، بعض ارکان ایسے ہیں کہ انہیں سکون و وقار کے ساتھ ادا کرنے سے نماز کے مجموعی عمل میں حسن و خوبی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن ان کے فوت ہوجانے سے نہ مجموعی عمل ناتمام رہتا ہے اور نہ کلی طور پر غرض و غایت فوت ہوتی ہے۔ ان افعال کا رتبہ پہلی قسم کے افعال سے کم ہے

اور ان کو "سنت اور مستحب" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے از خود ان افعال کا تجزیہ کر کے یہ نہیں بتلایا کہ فلاں عمل فرض ہے، فلاں سنت، اور فلاں مستحب، لیکن یہ حقیقت سب کے نزدیک مسلّم تھی کہ نماز کے تمام اعمال یکساں درجہ نہیں رکھتے۔ اس لیے مجتہدین نے اپنے اجتہاد کی رو سے ان کے مراتب کا تعین کیا، اور ان کے الگ الگ نام رکھے۔ اصولی اور بنیادی طور پر امام ابو حنیفہ نے بھی ایسا ہی کیا۔ بلکہ انہوں نے جس طرح سے دوسرے مسائل میں عقلی استدلال کو اس حد تک ملحوظ رکھا کہ ان کی فقہ میں زیادہ وسعت، گہرائی، اور گیرائی پیدا ہو گئی، اور ہر قسم کے معاشرے اور ہر دور کی سوسائٹی میں ان کے وضع کردہ اصول و ضوابط پر عمل کرنا زیادہ آسان ہو گیا، یہاں بھی انہوں نے دیگر ائمہ کی نسبت شریعت کے حکم (نماز) کی غرض و غایت اور مقصودِ اصلی پر گہری نظر رکھتے ہوئے مختلف ارکان کے مختلف رتبے معین کیے۔ مثلاً سب سے پہلے ان ارکان کا تعین ضروری تھا جن کے بغیر نماز ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ بات تمام مجتہدین کے نزدیک مسلّم ہے کہ نماز اصل میں اقرارِ بندگی، اظہار خشوع و خضوع کا نام ہے اور اس کے لیے نیّت، تکبیر، قرأت، اور رکوع و سجود ضروری ہیں۔ کیونکہ اظہارِ عبودیت کا اس سے بہتر اور واضح طریقہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ لہذا ان کو "فرض" قرار دیا گیا، (خود شارع نے بھی ان کے فرض اور لازی ہونے کی طرف اشارے کیے ہیں)۔ دوسرے ائمہ نے ان ارکان کی ادائیگی اور خصوصیات کو بھی فرض قرارا دیا حالانکہ ان خصوصیتوں کا لحاظ فرض کے درجہ میں نہیں تھا۔ ابو حنیفہ نے اصل ارکان کی ادائیگی اور ان کی خصوصیات کی ادائیگی میں فرق کیا۔ کیونکہ خصوصیات کو اصل رتبے پر رکھنا شریعت کے منشاء اور مزاج کے مطابق بھی نہ تھا، اور اس سے لوگوں کو دشواری ہوتی۔

شافعی مسلک کی رو سے زکوٰۃ آٹھوں مصارف (مدات) میں زکوٰۃ کا روپیہ تقسیم کرنا ضروری ہے۔ مگر امام ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ زکوٰۃ دینے والا یہ دیکھے کہ معاشرے میں ان طبقوں میں سے جو قرآن نے بیان کیے ہیں کون سا طبقہ زیادہ ضرورت مند ہے۔ جو طبقہ زیادہ مستحق ہے زکوٰۃ اسی کو دی جائے۔ بلکہ عملی زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ بعض معاشرے ایسے

ہیں کہ ان میں قرآن کے بیان کردہ آٹھوں طبقے موجود ہی نہیں ہیں۔ اس لیے امام ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ زکوٰۃ تقسیم کرنے والا فرد ہو یا اسلامی ریاست، اس کی صواب دید پر ہے کہ وہ آٹھ مصارف میں سے جس مصرف میں یا جن مصارف میں زکوٰۃ ادا کرنا زیادہ مناسب سمجھے انہی میں تقسیم کردے۔

امام ابو حنیفہ کے اس اجتہاد کی تائید حضرت عمر فاروقؓ کے اس فیصلے سے ہوتی ہے جو انہوں نے اپنے دورِ خلافت میں کیا تھا کہ تالیفِ قلب کے لیے کسی کو زکوٰۃ نہیں دی جائے گی۔ کیونکہ ان کے خیال کے مطابق اس وقت عملی طور پر یہ طبقہ (مؤلفۃ قلوب) موجود نہیں تھا۔

زکوٰۃ ہی کے بارے میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ چوپایوں کی زکوٰۃ میں اسلامی ریاست جانور ہی وصول کرے گی یا مالک کو یہ اختیار دے گی کہ وہ قیمت ادا کر دے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک جانوروں کی زکوٰۃ میں جانور دینا یا لینا ہی ضروری ہیں، ان کی قیمت نہیں دی جا سکتی۔ لیکن امام ابو حنیفہ کے نزدیک جانور بھی دیئے جا سکتے ہیں اور جانوروں کی قیمت بھی ادا کی جا سکتی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے زکوٰۃ کی فرضیت اور اس کی وصولی کی غرض و غایت پر نظر کی۔ اور وہ غرض دونوں صورتوں میں حاصل ہوتی ہے بلکہ بعض حالات میں ( اور آج کے معاشرے میں بھی) جانوروں کی وصولی سے کہیں زیادہ بہتر اور آسان طریقہ یہی ہے کہ قیمت وصول کر لی جائے۔(۲۳)

تیمّم کے بارے میں امام شافعیؒ نے کہا کہ : ایک شخص نے ایک نماز کے لیے تیمّم کیا، اس تیمّم سے وہ نماز ادا کر لی تو اس کا وہ تیمّم ختم ہو گیا۔ دوسری نماز کے لیے دوسرا تیمّم کر لے۔

امام ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ : تیمّم، پانی کے قائم مقام ہے۔ جب تک پانی نہیں ملے گا، تیمّم کی قائم مقامی باقی رہے گی۔ جس طرح ایک وضو سے متعدد نمازیں پڑھی جا سکتی ہیں اسی طرح ایک تیمّم سے بھی ایک سے زائد نمازیں ادا کی جا سکتی ہیں۔

## شورائی اجتہاد

فقہِ حنفی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ امام ابو حنیفہ کی ذاتی اور شخصی رائے پر مبنی نہیں ہے۔ تدوینِ فقہ کے لیے انہوں نے قانون ساز اسمبلی کی طرز پر ایک مجلسِ فقہاء تشکیل دی جس کے ارکان کی تعداد چالیس تھی، یہ تمام ارکان مختلف علوم و فنون کے ماہر تھے، قانون اسلامی کی ترتیب و تدوین میں جتنے علوم و فنون کے ماہرین کی ضرورت تھی، وہ سب اس مجلس میں جمع تھے۔ کوئی علوم قرآن کا ماہر تھا کوئی علومِ حدیث کا، کسی کی لغت پر گہری نظر تھی اور کوئی علم الانساب میں درجۂ کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ کوئی قاضی اور مفتی کے منصب پر فائز تھا، اس مجلسِ فقہ میں بطورِ خاص ایسے افراد بھی شامل کیے گئے تھے جن کی معاشرے کے گوناگوں اور نوبہ نو مسائل پر گہری نظر تھی۔ ان کے اپنے حلقۂ تلامذہ میں سے ایسے افراد بھی اس مجلس میں شریک تھے جنہیں سالہا سال تک وہ اپنے مدرسۂ قانون میں احکام و مسائل کو عقلی انداز میں سمجھنے اور پیش آمدہ مسائل کو قرآن و سنت کے دائرے میں رہتے ہوئے حل کرنے کی تربیت دے چکے تھے۔ ان چالیس ارکان کے بارے میں خود امام ابو حنیفہ کا یہ تبصرہ ان کے مقام و مرتبے کو متعین کرنے کے لیے کافی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ :

> "میں نے اپنی مجلسِ فقہ کے لیے جن افراد کا انتخاب کیا ہے ان میں سے اٹھائیس اس درجے کے ہیں کہ وہ قاضی (جج) کے منصب پر فائز کیے جا سکتے ہیں، چھ افراد فتویٰ دینے کی اہلیت رکھتے ہیں، ان میں دو ارکان ایسے ہیں جو قاضی اور مفتی تیار کر سکتے ہیں"۔ (۲۴)

## امام ابو حنیفہ کا تابعی ہونا

فقہِ حنفی کی باقی تین اماموں کی فقہ پر ترجیح اور فضیلت کی ایک اہم وجہ ابو حنیفہ کا تابعی ہونا بھی ہے۔ تمام تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ ابو حنیفہ نے کئی صحابہ کو دیکھا ہے اور ان سے ملاقات کی ہے۔ قرآن، حدیث اور اجماعِ امت سے یہ بات ثابت ہے کہ صحابۂ کرامؓ کے بعد تابعین کا درجہ ہے، اور تابعی ہونے کا شرف اور برتری تمام فقہاء اور مجتہدین میں ابو حنیفہ کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔

شیخ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں کہ :

"امام عبد الکریم شافعیؒ نے ایک مختصر رسالہ لکھا ہے جس میں ان حدیثوں کو جمع کیا ہے جو ابو حنیفہؒ نے براہِ راست صحابہ سے روایت کی ہیں، اختلاف صرف اس بات میں ہے کہ کتنی احادیث روایت کی ہیں، جب صحابہ سے براہ راست حدیث کی روایت ثابت ہو گئی تو صحابہ سے ملنا، اور انہیں دیکھنا بدرجۂ اولیٰ ثابت ہوگا۔ اور اس طرح ابو حنیفہؒ کی تابعیت شک و شبہ سے بالا ہو گی"۔(۲۵)

## علمی و فکری برتری

عقل، فہم و فراست، زہد و تقویٰ، اور قوتِ استنباط میں ابو حنیفہ کی حیثیت اس حد تک مسلمہ تھی کہ ان کے ناقدین بھی اسے تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ جن مسائل کے حل میں ان کے ہم عصر علماء عاجز و درماندہ ہوئے انہیں ابو حنیفہؒ کی نکتہ رسی نے حل کیا، امام شافعیؒ جو خود بھی امام مجتہد کی حیثیت سے ابھرے، اور جنہوں نے علم الفقہ کے اصول و ضوابط کی ترتیب و تدوین میں بلند اور منفرد مقام حاصل کیا، ابو حنیفہؒ کے بارے میں کہا کرتے تھے : سب لوگ (یعنی اہل علم) تفقہ اور مسائل کے اخذو استنباط میں ابو حنیفہ کی آل اولاد ہیں"، سفیان ثوریؒ کہتے ہیں کہ : ہم (علمائے حدیث و فقہ) ابو حنیفہ کے سامنے ایسے تھے جیسے ایک چڑیا، اور معمولی پرندہ باز کے سامنے ہوتا ہے، بلا شبہ وہ تمام علماء کے سردار تھے"۔(۲۶)

کتاب و سنت کے علم، خلفائے راشدین، صحابہ، اور تابعین کے فتاویٰ اور فیصلوں کی روشنی میں قوانین اسلام کو سب سے پہلے ابو حنیفہؒ نے مرتب کیا، بغیر کسی استثناء کے کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے کسی سے رہنمائی حاصل نہیں کی، وہ دوسروں کے لیے روشنی اور رہنمائی کا مینار بنے، ان کے بعد آنے والے تمام فقہاء اور مجتہدین نے ان کے مرتبہ اصول و قواعد سے استفادہ کیا۔ جلال الدین سیوطی جو شافعی المسلک ہیں، اس حقیقت کا اعتراف ان لفظوں میں کرتے ہیں :

"جن فضائل میں ابو حنیفہؒ منفرد ہیں ان میں ایک فضیلت یہ بھی ہے کہ وہ اولین شخص ہیں جنہوں نے قرآن و سنت کے علوم و مسائل کو مدوّن کیا، اور انہیں موضوع کے اعتبار سے مختلف ابواب میں ترتیب دیا، امام مالکؒ نے اپنی کتاب "المؤطا" کی ترتیب ابواب میں ابو حنیفہؒ کی پیروی کی، قانونِ شریعت کو ابو حنیفہ سے پہلے کسی نے مرتب و مدون نہیں کیا۔ کیونکہ صحابہ اور تابعین کا اعتماد قوتِ حافظہ پر تھا۔ ابو حنیفہ نے پہلی بار یہ محسوس کیا کہ ان کے علوم، فتاویٰ، فیصلے، اور آراء منتشر ہیں اگر ان کو جمع کر کے مرتب نہ کیا گیا، اور باقاعدہ قانون کی شکل نہ دی گئی تو مستقبل میں اِن کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے کیونکہ آئندہ لوگوں میں نہ ایسا حافظہ رہے گا، اور نہ ایسا زہد و تقویٰ اور دین کے معاملات میں احتیاط رہے گی۔ اس لیے ابو حنیفہؒ نے علم شریعت کو موضوع دار ابواب و فصول میں مرتب کر دیا"۔ (۲۷)

یہ ہیں وہ خصائص اور امتیازات فقہِ حنفی کے جن کی بنا پر ایک ایسا تجزیہ نگار جو چاروں اماموں کی یکساں قدر و منزلت اپنے دل میں رکھتا ہے، اور صرف دلیل و برہان کی مدد سے بات کرنے کا خواہاں ہے، یہ کہنے پر مائل ہوتا ہے کہ : حکومتی اور اجتماعی سطح پر احکام اسلام کے نفاذ کا مرحلہ جب بھی آئے گا، اس کے لیے حنفی فقہ سے زیادہ مضبوط، اور وسیع تر اساس کوئی بھی فقہی مسلک مہیا نہیں کر سکے گا۔

---

## حواشی و حوالہ جات


۱۔ خطیب البغدادی ۔تاریخ بغداد ۔(مطبع السعادہ قاہرہ ۱۹۳۱ء)۲۴۶/۲

۲۔ ابن حجر مکی ۔الخیرات الحسان ۔ص:۱۲

۳۔ شبلی نعمانی ۔سیرۃ النعمان ۔ص:۳۴

۴۔ ایضاً

۵۔ ابن خلدون :عبدالرحمٰن ۔مقدمہ

۶۔ تاریخ بغداد ۔۱۷۲/۲، نیز دیکھیے :فتح القدیر(ابن ہمام)۳۹۱/۲،
المیزان الکبریٰ (عبدالوہاب شعرانی)۔۵۲،۴۰/۱

۷۔ موفق بن احمد مکی ۔مناقب امام اعظم ۔(طبع :دائرۃ المعارف
حیدر آباد دکن۱۳۲۲ھ)۔۱۰۹/۲،۱۳۵/۱،

۸۔ ایضاً

۹۔ ایضاً

۱۰۔ ابن عبدالبر ۔الانتقاء :(طبع: مکتبہ قدسی مصر۱۳۵۰ھ)ص:۱۲،۱۴۳

۱۱۔ مناقب امام اعظم (مکی)۔۱۳۵/۱، نیز دیکھیے :مناقب امام اعظم (کردری)۹۰/۱

۱۲۔ بخاری :امام محمد بن اسماعیل ۔الجامع الصحیح ۔کتاب الصوم' باب الصوم فی السفر۔

۱۳، ایضاً ۔کتاب الجہاد ۔باب فضل الخدمتہ فی الغزو۔

۱۴۔ ایضاً ۔کتاب الصوم۔

۱۵۔ ترمذی: امام محمد بن عیسیٰ ،جامع ترمذی ،کتاب الصوم۔

۱۶۔ الجامع الصحیح (بخاری)۔کتاب الطہارۃ ،باب آداب الخلاء۔

۱۷۔ تاریخ بغداد (خطیب بغدادی)

۱۸۔ ایضاً

۱۹۔ اصول الکرخی (امام کرخی)۔ص:۱۷

۲۰۔ ابن نجیم :زین الدین بن ابراہیم ،الاشباہ والنظائر۔ص:۴۴۶۔

۲۱۔ تاسیس النظر۔ص:۱۵۹

۲۲۔ فتح القدیر (ابن ہمام)۔۳۹۱/۲

۲۳۔ ہدایہ ، مبسوط، بدائع الصنائع اور فقہ حنفی کی دوسری کتابوں میں اس کی تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔

۲۴۔ آج کے دور میں کسی کے لیے یہ کہنا کہ ''وہ فتویٰ دینے کی اہلیت رکھتا ہے''۔شاید کوئی اہم اور غیر معمولی بات نہ ہو۔کیوں کہ فتاویٰ کے جو مجموعے ہمارے سامنے ہیں،ان میں صورت حال یہ ہے کہ قرآن اور سنت تو کجا،قدیم فقہاء کے حوالے بھی کم نظر آتے ہیں۔برصغیر میں لکھے جانے والے اکثر فتاویٰ کا مدار،ردالمحتار، درمختار، فتاویٰ عالم گیری ،فتاویٰ تا تا ر خانیہ وغیرہ پر ہے۔لیکن اس دور میں، جس سے کم و بیش ایک صدی پہلے فتویٰ دینے کے حق دار،اور اہل ۔حضرت عمر فاروقؓ ،حضرت علیؓ ،حضرت عبداللہ بن مسعودؓ،حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ،اور حضرت عائشہ صدیقہؓ جیسے حضرات سمجھے جاتے ہوں،اس تناظر اور ماحول میں کسی کے لیے یہ کہنا کہ ''وہ فتویٰ دینے کی اہلیت رکھتا ہے''غیر معمولی نوعیت کی بات تھی۔

۲۵۔ مناقب امام اعظم (مکی) ۳۳/۱،نیز دیکھیے :الخیرات الحسان (ابن حجر مکی) ص:۲۱،توالی التاسیس (ابن حجر عسقلانی)،مناقب امام اعظم (کردری)۔ص:۵۷۔

۲۶، ۲۷۔ حوالۂ سابقہ

.....